درس ۱۳

اسلام کا معاشرتی اور سماجی نظام

سورۂ بنی اسرائیل کی آیات ۲۳ تا ۴۰ کی روشنی میں

(۲)

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا ۝ ﴾ (آیت ۳۲)

© rasailojaraid.com

زنا کا مکمل سدِّباب

اس آیۂ مبارکہ میں زنا کی جس شدت کے ساتھ ممانعت وارد ہو رہی ہے' وہ لفظ "لَا تَقْرَبُوْا" سے ظاہر ہے۔ اس سے پہلے سورۃ الفرقان میں بھی اس برائی کا ذکر آیا تھا' لیکن وہاں اسلوب مختلف تھا۔ وہاں عباد الرحمٰن کے اوصاف میں سے ایک اعلیٰ وصف یہ بیان کیا گیا کہ ﴿ وَلَا يَزْنُوْنَ ﴾ "وہ زنا نہیں کرتے" جبکہ یہاں انتہائی تاکیدی انداز سے نہی کے اسلوب میں حکم فرمایا جا رہا ہے کہ ﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی ﴾ "زنا کے قریب تک نہ پھٹکو"۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کے معاشرتی اور سماجی نظام میں اس سماجی برائی (Social Evil) کو ختم کرنے کے لئے ہر ممکن تدبیر اختیار کی گئی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ بہت دُور دُور تک قدغنیں لگائی گئی ہیں تاکہ کوئی اس فحش کام کے قریب تک نہ پھٹک سکے۔ اس لئے کہ ہمارے معاشرے اور ہمارے سماج میں عصمت و عفت اور پاک دامنی (Chastity) کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ ایک اسلامی معاشرے میں ہر ممکن تدبیر اور احتیاط اختیار کی جائے گی کہ اس بدکاری کے جو بھی محرکات' اسباب اور داعیات ہو سکتے ہیں' ان سب کے لئے بندشیں اور قدغنیں ہوں۔

© rasailojaraid.com

اس ضمن میں سب سے پہلی بات تو یہ نوٹ کیجئے کہ نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات میں بھی یہ وضاحت آئی ہے اور انجیل میں بھی یہ مضمون موجود ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی اس لفظ زنا کی وسعت کو ظاہر کیا ہے کہ یہ مجرد وہ فعل نہیں ہے جو اس لفظ سے عام طور پر مراد لیا جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں الفاظ آتے ہیں ((زِنَا الْعَيْنَيْنِ النَّظَرُ)) ”آنکھوں کی بدکاری نظربازی ہے“۔ اسی طرح حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہاتھوں کی بھی بدکاری ہے‘ پاؤں کی بھی بدکاری ہے‘ زبان کی بھی بدکاری ہے‘ کانوں کی بھی بدکاری ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ انسان کے یہ تمام اعضاء و جوارح بدکاری میں اپنا اپنا حصہ ادا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں ان تمام راستوں کو بند کیا گیا ہے جن کے باعث انسان کے اس جذبہ میں اشتعال و ہیجان پیدا ہو۔

یہ حقیقت [illegible] ہدف معین کرنے کے بعد کہ ہمیں اپنے معاشرے میں عصمت و عفت اور آبرو کی حفاظت کا اہتمام کرنا ہے اور بدکاری کا سدِّباب کرنا ہے‘ اب ہم جائزہ لیتے ہیں کہ اسلام میں اس کے لئے کیا تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرلیجئے کہ قرآن مجید میں جو لفظ ”زنا“ آیا ہے اور جس نے ہمارے دین میں ایک اصطلاح کی شکل اختیار کرلی ہے‘ اس ایک لفظ میں انگریزی زبان میں مستعمل تین الفاظ ”fornication“ ”adultery“ اور ”rape“ کا مفہوم موجود ہے۔

سب سے پہلے مثبت تدابیر کو لیجئے۔ ان میں اہم ترین مثبت تدبیر نکاح کو آسان بنانا ہے۔ اس لئے کہ اگر نکاح مشکل ہو‘ ہزاروں لاکھوں روپے کے انتظام کے بغیر نکاح نہ ہو سکے تو ظاہر بات ہے کہ شہوت کے جبلی تقاضے کی تسکین کے لئے بدکاری کی طرف رجحان ہوگا۔ جب تک جائز راستے کو کھولا نہ جائے اور اسے آسان نہ بنایا جائے اس وقت تک ناجائز راستوں کو بند کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ جس طرح پانی کے بہاؤ کے راستہ میں رکاوٹ ہو تو وہ سیدھا راستہ چھوڑ کر اِدھر اُدھر سے اپنا راستہ بنالیتا ہے‘ اسی طرح جنسی جذبے کی آسودگی کے جائز راستوں کو مشکل بنادیا جائے گا تو وہ ناجائز راستے تلاش کرے گا۔ لہٰذا اسلامی معاشرے میں زنا کے فعل قبیح کو روکنے والا اہم قدم تسہیلِ نکاح یعنی نکاح کو آسان بنانا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام میں نکاح کے لئے رسومات کا کوئی طومار

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

نہیں۔ نہ ہی یہ نام و نمود کی نمائش اور دھوم دھڑکّے کے اظہار کا کوئی ذریعہ ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر ہمارے یہاں بدقسمتی سے جو کچھ ہوتا ہے وہ درحقیقت ایک ملغوبہ ہے کہ ہم نے کچھ چیزیں تو اسلام کی اختیار کیں اور کچھ ہندووانہ معاشرت کی اپنا لیں۔ ہماری آبادی کی اکثریت ان ہندوؤں کی نسل سے تعلق رکھتی ہے جو ہندوستان میں آباد تھے اور انہوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ یہ نومسلم اپنی سابقہ رسومات' روایات اور رواجات بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ چنانچہ ہماری سماجی رسومات ایک کھچڑی ہے۔ ان میں ہندوانہ رسومات بھی شامل ہیں اور کچھ اسلامی افعال و اعمال کو بھی ہم نے ان میں داخل کر لیا ہے۔ ورنہ یہ دھوم دھڑ کا' یہ جہیز دینے کی رسم اور یہ بارات کا تصور' جیسے ایک لشکر کہیں فتح کرنے کے لئے جا رہا ہو اور پھر بہت سی دوسری لغو اور فضول رسومات' یہ سب کچھ ہندوانہ پس منظر کی حامل چیزیں ہیں۔ اسلام کا معاملہ نہایت سادہ طریق پر ایجاب و قبول ہے۔ اسلام نے شادی کا جشن (celebration) لڑکے کے ذمہ رکھا ہے کہ وہ دعوتِ ولیمہ کرے اور اپنی وسعت کے مطابق اپنے اعزہ و اقارب اور احباب کو اپنی خوشیوں میں شامل کرے۔ پس پہلی چیز تو یہ ہے کہ نکاح کے راستے کو آسان بنایا جائے تاکہ کسی بھی نوجوان کا دھیان غلط رُخ کی طرف نہ جائے۔

دوسرا مثبت طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ جنسی جذبہ کو ہیجان اور اشتعال دینے والی تمام چیزوں کو سختی سے روک دیا گیا ہے۔ مثلاً شراب کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ یہ انسان کے جنسی داعیہ کو اُکساتی ہے۔ بعض دوسری منشیات کا اثر بھی اسی طرح کا ہوتا ہے۔ اسلام ان کو حرام قرار دیتا ہے تاکہ انسان بے خود ہو کر آپے سے باہر نہ ہو جائے۔ اس کی خودی کی گرفت اس کے پورے وجود پر رہے' اس کا شعور معطل نہ ہو اور وہ جنسی ہیجان سے شکست نہ کھا جائے' بلکہ ہر طرح سے بیدار رہے۔ اسی طرح رقص اور موسیقی کا بھی اسلامی معاشرے میں سدباب کیا گیا ہے' کیونکہ یہ بھی جنسی جذبے میں ہیجان پیدا کرتی ہیں۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ جب تک ان چیزوں کا سدباب نہیں ہو گا جن کے متعلق اسلام چاہتا ہے کہ معاشرے سے بیخ و بُن کی طرح اُکھڑ جائیں' اُس وقت تک زنا کی روک تھام ممکن نہیں ہو گی۔

© rasailojaraid.c

پھر اسلام اپنے معاشرے میں مَردوں اور عورتوں کے آزادنہ اختلاط کو پسند نہیں کرتا بلکہ مَردوں اور عورتوں کے علیحدہ علیحدہ دائرہ کار متعین کرتا ہے۔ عورت کا اصل دائرہ کار اس کا گھر ہے۔ جیسے سورۃ الاحزاب میں فرمایا : ﴿ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُوْلٰى ﴾ (آیت ۳۳) "اپنے گھروں میں قرار پکڑو اور سابقہ دورِ جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو"۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عورت ضرورت کے تحت بھی گھر سے نہیں نکل سکتی۔ اسے ضرورت کے تحت نکلنے کی اجازت ہے اور اس کے لئے بھی اسی سورۂ مبارکہ میں حکم موجود ہے کہ ﴿ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ﴾ (آیت ۵۹) یعنی وہ اپنے پورے وجود کو ایک چادر میں لپیٹ کر چہرے پر ایک پلو اس طرح لٹکالیا کریں کہ راستہ آسانی سے دیکھ سکیں اور حجاب کا تقاضا بھی پورا ہو سکے۔ یہاں میں نے "ضرورت کے تحت" کی جس قید کا ذکر کیا ہے وہ خود نبی اکرم ﷺ نے لگائی ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں روایت موجود ہے کہ حضورؐ نے فرمایا : ((قَدْ اَذِنَ اللّٰهُ لَكُنَّ اَنْ تَخْرُجْنَ لِحَوَائِجِكُنَّ)) "اللہ تعالیٰ نے تم (عورتوں) کو اجازت دی ہے کہ تم اپنی ضروریات کے لئے گھر سے نکل سکتی ہو"۔ مذکورہ بالا آیاتِ مبارکہ میں بناؤ سنگار اور سج دھج کے ساتھ گھر سے نکلنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے اور اس فعل کو جاہلیت کا فعل قرار دیا گیا ہے۔

اسی سورۃ الاحزاب کی آیت ۵۳ میں اہل ایمان سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تمہیں نبی اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات سے کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کی اوٹ سے مانگو ﴿ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ﴾ آیت کے اس حصے میں دو باتیں خاص طور پر قابل توجہ ہیں، ایک یہ کہ اس میں لفظ "حجاب" آیا ہے جس کے معنی ہر پڑھا لکھا شخص جانتا ہے کہ "پردہ" کے ہیں۔ دوسری یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا جا رہا ہے جن کے لئے ازواج مطہرات بمنزلہ روحانی ماں ہیں، جو اُمّہات المؤمنین ہیں، کہ ان سے بھی اگر کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کی اوٹ سے مانگیں۔ یہ اسلوب اس بات پر صریح دلالت کر رہا ہے کہ اسلام اپنے معاشرتی نظام میں مَردوں اور عورتوں کے مابین اختلاط کو روکنے کے لئے کیسی کیسی احتیاطیں ملحوظ رکھ رہا ہے۔ اس ضمن میں یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ کہیں

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

تنہائی میں نامحرم مَرد اور عورت اکٹھے نہ رہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جہاں کہیں نامحرم مَرد اور عورت اکیلے ہوں گے وہاں تیسرا شیطان موجود ہو گا۔

اب آگے بڑھئے' لباس کے سلسلے میں ہماری تہذیب و تمدن کی جو روایات بنی ہیں وہ یوں ہی نہیں بن گئیں۔ اسلام نے ستر کا تصور دیا ہے اور اس کے لئے مستقل احکام دیئے ہیں۔ ستر سے مُراد جسم کے وہ حصے ہیں جو ڈھکے رہنے چاہئیں۔ ستر پوشی کا شعور اللہ تعالیٰ نے انسان کی جبلت و فطرت میں رکھا ہے۔ چنانچہ وحشی سے وحشی قبائل کو بھی آپ جا کر دیکھیں تو چاہے ان کا پورا جسم ننگ دھڑنگ ہو لیکن وہ پتّوں سے اپنے جسم کے کچھ حصوں کو چھپاتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ تقاضائے فطرت ہے۔ اسلام کی رُو سے مَرد کا ستر ناف سے لے کر گھٹنے کے نچلے حصہ تک ہے' اس پر کسی کی نگاہ نہیں پڑنی چاہئے' یہ ہر حال میں ڈھکا رہنا چاہئے۔ چنانچہ کسی بیٹے کے سامنے باپ کے جسم کا بھی یہ حصہ نہیں کھلنا چاہئے۔ اسی طرح کسی بھائی کے سامنے اس کے بھائی کا بھی یہ حصہ نہیں کھل سکتا' یہ ستر ہے۔ اب عورت کے بارے میں دیکھئے۔ عورت کے بارے میں فرمایا گیا کہ ((اَلْمَرْءَۃُ عَوْرَۃٌ)) یعنی "عورت کا پورا جسم ستر ہے"۔ واضح رہے کہ لفظ "عورت" کا معنی ہی چھپانے کے قابل شے ہے۔ اسی طرح ہمارے یہاں عورتوں کے لئے لفظ "مستورات" استعمال ہوتا ہے' مستور ستر سے بنا ہے' اس کے معنی چھپی ہوئی شے کے ہیں۔ اس سے مستثنٰی عورت کے جسم کے صرف تین حصے ہیں' چہرے کی ٹکیہ' ہاتھ اور ٹخنے سے نیچے پاؤں۔ یہ تین حصے ستر نہیں ہیں' باقی پورا جسم ستر ہے۔ عورت کا سر بلکہ بال بھی ستر میں داخل ہیں۔ اب سمجھئے کہ ستر کے کیا معنی ہیں! یہ کہ عورت کے جسم کے ان تین حصوں کے سوا کسی اور حصے پر اس کے بھائی یا باپ کی نگاہ بھی نہیں پڑنی چاہئے۔ یہ حصے ہر حال میں مستور رہیں گے۔ ستر سے آگے کا معاملہ شوہر اور بیوی کے لئے ہے۔ البتہ کسی اشد اور ناگزیر صورتحال میں مرد یا عورت کے ستر کا کوئی حصہ طبیب' ڈاکٹر یا جراح کے سامنے کھولا جا سکتا ہے۔ باقی باپ' بیٹا' بھائی' بہن ان سب کے لئے ستر کی پابندی ضروری ہے۔

اسی ستر کے ضمن میں نبی اکرم ﷺ نے مزید فرمایا کہ عورت کا ایسا لباس جس سے بدن چھلکتا ہو یا اس کی رعنائیاں نمایاں ہوتی ہوں ستر نہیں ہے' بلکہ ایسا لباس پہننے والی

© rasailojaraid.co
© rasailojaraid.co

عورتوں کو حضورؐ نے "كَاسِيَاتٌ عَارِيَاتٌ" قرار دیا ہے' یعنی لباس پہننے کے باوجود یہ عورتیں عریاں ہیں۔ صحیح بخاری میں اُمّ المومنین حضرت سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک طویل روایت کے آخری الفاظ ہیں : ((رُبَّ كَاسِيَةٍ فِي الدُّنْيَا عَارِيَةٌ فِي الْآخِرَةِ)) "دنیا میں کپڑے پہننے والی بہت سی عورتیں آخرت میں عریاں ہوں گی"۔ حدیث کے ان الفاظ سے ایسے باریک اور ایسے چست کپڑے پہننا مراد ہے جن سے جسم جھلکے یا عورت کی رعنائی کی چیزیں نمایاں ہوں۔ ایسی عورتوں کو کپڑے پہننے کے باوجود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ننگی قرار دیا ہے۔

ایک مزید چیز جو ہماری تہذیب کا جزو ہے اور جو ہماری معاشرت میں قرآن مجید کے حکم کے مطابق داخل ہوئی ہے وہ عورت کا دوپٹہ یا اوڑھنی ہے۔ ہماری معاشرت' ہماری تہذیب اور ہمارے تمدن کی اساسات کتاب اللہ میں موجود ہیں' اس کا تفصیلی ڈھانچہ جناب محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنایا ہے' پھر وہ ہماری معاشرتی زندگی میں پیوست ہو گیا ہے۔ چنانچہ ہمارے یہاں دوپٹہ کا جو تصور اور استعمال ہے اس کا حکم بھی قرآن مجید میں موجود ہے۔ سورۃ النور میں فرمایا : ﴿ وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ﴾ "اور عورتیں اپنے سینوں پر اپنی چادروں کے آنچل ڈال لیا کریں"۔ یعنی بکل مار لیا کریں۔ چاہے کسی خاتون نے کرتا پہنا ہوا ہے اور وہ موٹا بھی ہے' ڈھیلا بھی ہے' اس سے جسم تو ڈھک گیا' لیکن ابھی مزید کی ضرورت ہے' اور وہ دوپٹہ یا اوڑھنی ہے جسے اوڑھ کر عورت کا سر' سینہ' کمر سب اچھی طرح ڈھک جائیں۔ اگرچہ اِس دَور میں مغربی تہذیب کے اثرات کی وجہ سے ہمارا تمدن اس اعتبار سے ایک ملغوبہ بن رہا ہے کہ کچھ اسلامی اقدار بھی موجود ہیں' کچھ مغربی اقدار بھی آ گئی ہیں اور اس میں کچھ ہندووانہ رسوم و رواج بھی شامل ہیں' ان سب کے امتزاج سے ہمارے معاشرے میں فی الوقت ایک عجیب کھچڑی پکی ہوئی ہے۔ چنانچہ ہماری نوجوان لڑکیاں جس قسم کا دوپٹہ استعمال کرتی ہیں وہ اس حکم کے منشاء کو پورا نہیں کرتا بلکہ اس کے بالکل خلاف ہے۔ یہ بات سمجھ لیجئے کہ یہ بات گھر میں بھی پسندیدہ نہیں ہے کہ نوجوان لڑکی کا سینہ بغیر دوپٹے کے ہو۔ کون نہیں جانتا کہ عورت کے جسم میں سب سے زیادہ جاذبِ نظر اس کا سینہ ہوتا ہے۔ لہٰذا حکم دیا جا رہا ہے کہ ﴿ وَلْيَضْرِبْنَ

© rasailojaraid.co
© rasailojaraid.co

بِخُمُرِهِنَّ عَلٰی جُیُوْبِهِنَّ﴾

پھر اسی سورۃ النور کی آیت ۳۰ میں تمام اہل ایمان مَردوں اور آیت ۳۱ کی ابتداء میں تمام مسلمان خواتین کو غضِ بصر کا حکم دیا جا رہا ہے۔ مَردوں کے لئے فرمایا : ﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ﴾ "(اے نبیؐ) مؤمن مَردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں"۔ اسی طرح عورتوں کے لئے فرمایا : ﴿وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِھِنَّ﴾ "اور (اے نبی) مومن عورتوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں"۔ ان آیات میں غضِ بصر سے مُراد نگاہ بھر کر دیکھنے کی ممانعت ہے۔ یعنی مَرد اپنی بیوی کے علاوہ کسی محرم خاتون کو بھی اور عورت اپنے شوہر کے علاوہ کسی محرم مَرد کو بھی نگاہ بھر کر نہ دیکھے۔ جب محرموں کے نگاہ بھر کر دیکھنے کی ممانعت کی جا رہی ہے تو غیر محرموں کے لئے خود بخود اس پابندی کا وزن بہت بڑھ جائے گا۔ چنانچہ اس قسم کی دیدہ بازی کو حدیث شریف میں آنکھ کے زنا سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ ایک طویل روایت میں ہے : ((اَلْعَیْنَانِ تَزْنِیَانِ وَزِنَاھُمَا النَّظْرُ)) "آنکھیں زنا کرتی ہیں اور ان کا زنا نظربازی ہے"۔ ایک اور مشہور حدیث کا مفہوم ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے سرخیلِ اَتقیاء حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا "اے علی' کسی نامحرم پر اچانک اور بلاارادہ پہلی نگاہ کا پڑ جانا معاف ہے' لیکن ارادتاً دوسری نگاہ ڈالنا قابلِ مواخذہ ہے"۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم دیکھیں کہ قرآن مجید ہمیں کیا احکام دے رہا ہے اور نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات کیا ہیں۔ ان سب کے جو اثرات ہمارے تمدن پر مترتب ہوئے ہیں وہ بہت واضح ہیں۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ مسلمان عورت کا ساتر لباس کیسے وجود میں آیا! مسلمانوں کے گھروں کی تعمیر کا کیا مزاج بنا! آج کل کے کوٹھی نما طرزِ تعمیر کے وجود کو پچاس ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا' ورنہ مسلمان چاہے امیر ہوتا تھا چاہے غریب' گھر خواہ بڑا ہوتا تھا خواہ چھوٹا' اس میں زنانہ اور مَردانہ حصے علیحدہ علیحدہ ہوتے تھے۔ پہلے مَردانہ حصہ آتا' پھر ڈیوڑھی ہوتی اور اس ڈیوڑھی سے آگے زنانہ حصہ ہوتا اور زنانہ حصے کے صحن کے چاروں طرف تعمیر ہوتی تھی۔ مسلمانوں نے اسلام کی تعلیمات کے زیر اثر اپنے تمدن میں اس طرزِ تعمیر کو ترقی اور نشوونما دی ہے۔

© rasailojaraid.com

الغرض اسلام نے محرکاتِ زنا کے سدباب کے لئے بہت دُور رس اقدامات کئے ہیں۔ ان میں سے چند ایک کے بیان پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔ ان پابندیوں اور قدغنوں کا مقصود یہی ہے کہ بدکاری کے قریب بھی نہ پھٹکا جائے ﴿ وَلَا تَقْرَبُوْا الزِّنٰی اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا ۝ ﴾ اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ یہ بے حیائی کا کام تو ہے ہی' یہ ایک بہت بُرا راستہ بھی ہے جس پر کوئی معاشرہ پڑ جائے تو وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔

اب غور کیجئے' اِس دَور میں ایک طرف تو فرائڈ کا نظریہ ہے اور نفسیات کا کون سا طالب علم یہ نہیں جانتا کہ اس نے جنس کو کس قدر مؤثر عامل مانا ہے۔ اس کے فلسفہ کی رُو سے اس کے انسانی زندگی کے تمام تفصیلی ڈھانچہ میں جنسی جذبہ کہیں نہ کہیں کارفرما ہے اور اس کے اثرات کم و بیش موجود ہیں۔ حد یہ ہے کہ اس کے فلسفہ کے مطابق اگر ایک باپ اپنی چھوٹی بچی کو پیار کرتا ہے اور ایک ماں اپنے چھوٹے بچے کو گود میں لے کر اس کو چومتی ہے تو وہ اس کا محرک بھی جنس کو قرار دیتا ہے۔ جبکہ دوسری طرف ہم اپنے آپ کو یہ کہہ کر دھوکہ دیتے ہیں کہ اسلام میں ستر و حجاب کی یہ پابندیاں اور قدغنین شاید ثقافت' تہذیب اور تمدن کے اعتبار سے پس ماندہ لوگوں کے لئے ہوں گی۔ یہ ہمارا ایک علمی و فکری تضاد ہے۔ فرائڈ نے اپنے نظریہ کی بنیاد اپنے تجربات و مشاہدات پر رکھی ہے اور یہ یقیناً گمراہی ہے اور اس میں نہایت مبالغہ ہے۔ لیکن اگر اس کا دسواں حصہ بھی صحیح ہو تو جو نظامِ اسلام نے دیا ہے اس کے بغیر اس قسم کی برائیوں کی روک تھام ممکن نہیں ہے۔

یہ مثبت اقدامات کرنے کے بعد اب اسلام منفی قدم اٹھاتا ہے اور وہ ہے حدود و تعزیرات۔ ان پابندیوں اور قدغنوں کے باوجود اگر کوئی شخص گندگی میں منہ مارتا ہے' بدکاری میں ملوث ہوتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی فطرت مسخ ہو چکی ہے' اس کے اندر گندگی گھر کر چکی ہے۔ لہٰذا ایسے شخص کے لئے سزا بہت سخت ہے۔ یعنی کوئی غیر شادی شدہ مرد یا عورت اس قبیح فعل میں ملوث ہو جائے تو اس کی سزا اسلام نے سو کوڑے رکھی ہے جبکہ شادی شدہ مرد و عورت میں سے کوئی اس کا ارتکاب کرے تو اس کی سزا رجم یعنی سنگساری ہے۔ غیر شادی شدہ کے لئے عقل و منطق کی رو سے کسی قدر رعایت کا معاملہ سمجھ میں آتا ہے' کیونکہ اس کے لئے اپنی جبلت کے منہ زور تقاضے کو پورا کرنے کا کوئی

© rasailojaraid.com

جائز راستہ موجود نہیں ہے' لہٰذا ایسا فرد غلط رُخ پر پڑ گیا ہے تو کچھ نرمی کا مستحق ہے۔ چنانچہ ایسے افراد کے لئے سو کوڑوں کی سزا مقرر کی گئی۔ لیکن شادی شدہ مَرد و عورت کے لئے رجم کی سزا ہے' جس کو دینی اصطلاح میں "حد" کہا جاتا ہے' یعنی ایسے افراد کو بر سر عام سنگسار کر دیا جائے۔

اس میں شبہ نہیں کہ رجم کی سزا بہت سخت سزا ہے' لیکن اس کی بے شمار حکمتیں ہیں۔ سب سے نمایاں حکمت تو یہ ہے کہ اس سزا سے پورا معاشرہ عبرت پکڑے اور اس قبیح فعل کے ارتکاب سے مجتنب رہے۔ دوسری حکمت یہ نظر آتی ہے کہ شادی شدہ جوڑے میں باہمی محبت و اعتماد کا رشتہ مضبوط رہے۔ تیسری حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ حسب و نسب میں خلل واقع نہ ہو۔ البتہ یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنی ضروری ہے کہ زنا کی ان دونوں سزاؤں کے ساتھ یہ شرط عائد کر دی گئی ہے کہ اس فعل قبیح کی شہادت دینے والے چار عینی گواہ موجود ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس فعل کو اس طور پر انجام دینا کہ چار چشم دید گواہ بھی موجود ہوں اس فعل کی شناعت و قباحت میں کئی گنا اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔ یہ گویا معاشرے کے لئے سرطان کے پھوڑے کی مانند ہے' جس سے معاشرے کو محفوظ رکھنے کے لئے لازمی ہے کہ اس کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکا جائے۔ یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اسلام کی تاریخ میں رجم کی سزا اقراری مجرموں کو دی گئی ہے۔ یعنی ان افراد کو جن کے ضمیر نے اتنی ملامت کی کہ انہوں نے عذابِ اُخروی سے نجات پانے کے لئے اپنے اس گناہ کا اعتراف کر کے اس دنیا کی سزا قبول کر لی تاکہ وہ اس سزا کے بعد یہیں پاک ہو جائیں اور آخرت کی عقوبت سے بچ سکیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کے جملہ محرکات سے محفوظ و مامون رکھے۔

قتلِ ناحق کی ممانعت

اگلا حکم ارشاد ہوا : ﴿ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ﴾ "نہ قتل کرو کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ"۔ یہ الفاظ بڑے قابل غور ہیں۔ انسانی جان بہت محترم ہے۔ انسان کی جان کا ناحق لے لینا' خونِ ناحق بہانا' یہ بہت

© rasailojaraid.co

بڑا جرم ہے' بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ترتیب میں تو شرک کے بعد یہی آتا ہے' اس کے بعد زنا کا معاملہ آئے گا۔ اس لئے کہ تمدن کی اصل اساس اور جڑ تو یہی ہے۔ انسان کو جو متمدن حیوان اور Gregarious Animal کہا جاتا ہے تو اس کے تمدن کی جڑ یہی احترامِ جان ہے۔ اگر کسی معاشرے میں ایک دوسرے کی جان کا احترام ہی نہ رہے تو ظاہر بات ہے کہ گویا تمدن کی جڑوں پر کلہاڑا رکھ دیا گیا ہے۔ یہ وہ بات ہے جو سورۃ المائدہ میں ہابیل اور قابیل کے واقعے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمائی کہ جس کسی نے ایک انسان کی جان بھی ناحق لی ﴿ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ' وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ﴾ "اس نے گویا پوری نوعِ انسانی کو قتل کر دیا' اور جس نے ایک انسان کی جان بچائی اس نے گویا پوری نوعِ انسانی کی جان بچائی"۔ اس لئے کہ حقیقتاً قتلِ ناحق انسانی تمدن کی جڑوں کو کاٹتا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ ﴿ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ ﴾ "جس جان کو اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے اس کو قتل نہ کرو۔"

اس کے ساتھ ہی فرمایا : ﴿ اِلَّا بِالْحَقِّ ﴾ یہاں استثناء بیان کر دیا گیا کہ "مگر حق کے ساتھ۔" اب یہ بہت اہم معاملہ ہے۔ "بِالْحَقِّ" سے مراد ہے "قانون کے تحت" جہاں کہیں حق واقع ہو جائے۔ اس حق کے واقع ہونے کی شریعت اسلامی نے چند صورتیں معین کر دی ہیں۔ قتلِ عمد کی سزا میں ایک صورت یہ ہے کہ قاتل کو قتل کیا جائے۔ اس سزا کی ایک دوسری متبادل صورت بھی ہے جو بعد میں عرض کی جائے گی۔ بہرحال قتلِ عمد کی سزا کے طور پر کسی قاتل کو قتل کر دینا "اِلَّا بِالْحَقِّ" کی پہلی صورت ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ (جیسا کہ پچھلی آیت کی وضاحت میں بیان کیا گیا) اگر کوئی شادی شدہ مرد یا عورت زنا کا ارتکاب کرے تو قانونِ اسلامی میں اس کی سزا بھی موت ہے' بلکہ بڑی بھیانک اور عبرتناک موت جس کو ہم رجم یعنی سنگسار کرنے سے تعبیر کرتے ہیں۔ تیسری صورت یہ ہے کہ اسلامی ریاست میں اگر کوئی مسلمان مرتد ہوتا ہے تو اس کی سزا بھی اسلامی قانون میں قتل ہے۔ اور چوتھی شکل ہے حربی کافر کا قتل' یعنی جس کے ساتھ اعلانِ جنگ ہو چکا ہو۔ کافر اگر ذمی ہے تو وہ اسلامی ریاست کا شہری ہے' اسلامی ریاست نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے' اس کی جان بھی اتنی ہی محترم ہے جتنی کسی بھی مسلمان

© rasailojaraid.com

شہری کی۔ تو یہ چار صورتیں ہیں کسی انسان کی جان لینے کی جن کو شریعت اسلامی نے جائز اور صحیح قرار دیا ہے۔ انسانی جان کا احترام لازم ہے' انسانی تمدن کی یہی جڑ' بنیاد اور اساس ہے۔

اس کے بعد فرمایا : ﴿ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ○ ﴾ جو شخص ناحق قتل ہوا ہے' یعنی بِالْحَقِّ قتل نہیں ہوا بلکہ قتل ناحق کا شکار ہوا ہے' اس کے ورثاء کو ہم نے ایک اختیار (سلطان) دیا ہے۔ سلطان کے معنی سند اور اختیار کے ہیں۔ بادشاہوں کی طرف سے اگر کوئی فرمان آتا ہے تو وہ بھی سلطان ہے۔ تو یہ سلطان' اللہ کی طرف سے اس مقتول کے ورثاء کو حاصل ہوتا ہے جس کو ناحق قتل کیا گیا ہو۔ اس کے ولی اور اس کے وارث کو قاتل کے سلسلے میں ایک اختیار حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ قاتل کی جان لے سکتا ہے۔ گویا کہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس ضمن میں مالک اور مختار بنا دیا جاتا ہے۔ شریعت اسلامی نے اسے یہ قانونی حق دیا ہے۔ قانون کی مشینری اور حکومت کا نظام صرف یہ کریں گے کہ قاتل کو پکڑیں گے۔ اس پر جرم کے اثبات اور ثبوت کے سلسلے میں ساری کارروائی حکومت کے ذمے ہے' لیکن آخری فیصلے کے معاملے میں مقتول کے ورثاء کو اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے تو خون کے بدلے خون لیں' جان کے بدلے جان لیں' اور چاہیں تو جان بخشی کر دیں —— اور اس کی بھی دو صورتیں ہیں' چاہیں تو احسان کریں اور بغیر کسی معاوضے کے معاف کر دیں اور چاہیں تو خون بہا قبول کر لیں۔ یہ بڑا حکیمانہ قانون ہے' اگرچہ ظاہر ہے کہ کسی قبائلی معاشرے میں اس کا جتنا scope تھا ہمارے جدید معاشرے میں اس کا سکوپ اتنا نہیں ہے۔ اس لئے کہ قبائلی نظام میں مقتول کے ورثاء کا تعین ہوتا ہے' یہ سارا معاملہ بالکل کھلا ہوتا ہے' لیکن یہاں اب ہماری شہری سوسائٹی میں تمدن کے اس مرحلہ میں کچھ معاملات اتنے واضح نہیں ہیں جتنے کہ اُس دَور میں ہوتے تھے۔ بہرحال اسلامی قانون میں یہ ایک امکان اور متبادل موجود ہے۔ اور واقعتاً جان بخشی کی بڑی برکات ہیں۔ اس لئے کہ اس سے جو انتقامی قتل کا سلسلہ چلا کرتا ہے اس کے رُکنے کے بڑے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک تو واقعہ یہ ہے کہ مقتول کے ورثاء کے زخم پر گویا کہ مرہم رکھا جاتا ہے۔

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

انہیں اُس وقت ایک عجیب تسکین ہوتی ہے جب انہیں یہ احساس ہو جائے کہ اب قاتل کی جان ہمارے ہاتھ میں ہے، ہم چاہیں تو بخشیں اور چاہیں تو اس کا خون بہا دیں۔ یہ اختیار حاصل ہو جانا زخمی دلوں کے لئے اپنے اندر مرہم کی تاثیر لئے ہوئے ہے۔ اور پھر یہ کہ اگر کسی مقتول کے ورثاء کی طرف سے اتنا بڑا معاملہ ہو جائے کہ قاتل کی جان ان کے قابو میں آنے کے بعد انہوں نے اس کو بخش دیا ہو تو یہ چیز معاشرے کے اندر بڑے صحت مند اور مثبت نتائج پیدا کرنے والی ہے۔ بجائے اس کے کہ دشمنی پر دشمنی اور قتل در قتل کا سلسلہ چلتا جائے یہ چیزیں اس معاملے کے اندر بہت بہتر صورت حال سامنے لاتی ہیں۔ بہر حال یہ ہے قتل نفس کی شناعت اور اہمیت کہ یہ تین سب سے بڑے گناہوں میں سے ہے۔

اس قتل ناحق کے سلسلے میں مقتول کے ورثاء کو بھی ایک ہدایت دی گئی کہ ﴿ فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ﴾ کہ وہ قتل کے معاملے میں حد سے آگے نہ بڑھیں۔ اسراف فی القَتل کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ اُس سوسائٹی میں مختلف قبائل مدعی تھے کہ ہماری عزت زیادہ ہے، ہمارے ایک شخص کی جان کسی دوسرے قبیلے کے دو افراد کی جان کے برابر ہے، ہمارا اگر ایک قتل ہوا ہے تو اس قبیلے کے دو افراد قتل کئے جائیں گے۔ یہ اسراف فی القتل کی ایک صورت ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ قاتل کو مقتول کے ورثاء کے حوالے کر دیا جائے تو اب وہ خود اسے اذیتیں دے دے کر اور اس کے اعضاء کو ایک ایک کر کے کاٹ کر قتل کریں اور اسے پوری طرح اپنے انتقامی جذبے کا تختہ مشق بنائیں۔ یا یہ کہ خون بہا لے لیا جائے لیکن پھر بھی دلی کدورت ختم نہ ہو، انتقامی جذبات پھر بھی موجود رہیں۔ یا یہ کہ قتل کے بدلے قتل بھی ہو گیا ہے پھر بھی جذبات ٹھنڈے نہیں ہو رہے اور مزید قتل کیلئے دل کے اندر عزائم اور ارادے پروان چڑھ رہے ہیں۔ یہ ساری صورتیں اسراف فی القتل کی ہیں۔ چنانچہ ﴿ فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ﴾ کے زیرِ عنوان ان سب کا سدِّباب کر دیا گیا۔ آگے فرمایا: ﴿ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ﴾ اسلامی معاشرہ مقتول کے ورثاء کو مدد دے گا کہ وہ اپنا قصاص اور انتقام حاصل کریں۔ لیکن بہر حال ان کے لئے بھی کچھ حدود ہیں کہ جن کا انہیں پابند ہونا ہے۔

© rasailojaraid.com

مالِ یتیم کے بارے میں احتیاط کا حکم

اس کے بعد جو اخلاقی ہدایت کا سلسلہ شروع ہوا تو سب سے پہلی چیز آئی ﴿ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ ﴾ "یتیم کے مال کے قریب بھی نہ پھٹکو"۔ یہاں بھی وہی انداز ہے جو زنا کے بارے میں آیا کہ ﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى ﴾ تو فرمایا : ﴿ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ "یتیم کے مال کے قریب بھی نہ پھٹکو' سوائے اس طور اور طریقے کے جو بہت ہی اعلیٰ اور بہت ہی عمدہ ہو"۔ اس میں درحقیقت ہدایت دی جا رہی ہے اُس معاشرے کو جس میں یہ رواج تھا کہ ایک طرف تو وراثت کو سمیٹنے کی کوشش کی جاتی تھی اور متوفیٰ کا بڑا لڑکا یا بڑے لڑکے پوری کی پوری وراثت پر قابض ہو جاتے تھے۔ تعدّدِ اَزدواج تو وہاں موجود تھا۔ اب ہوتا یہ کہ ایک شخص نے ابھی چند سال ہوئے شادی کی ہے' اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں' اس کی پہلی شادی سے جوان اولاد موجود ہے' اب اس کا جو بھی ترکہ ہے اس پر وہ جوان بیٹے قابض ہو گئے ہیں اور اس کی نابالغ اولاد بالکل محروم ہو گئی ہے' بلکہ محتاج ہو کر معاشرے میں بھیک مانگنے پر مجبور ہو رہی ہے۔ یا یہ کہ کسی یتیم کا کوئی ولی اور سرپرست ہے اور مختلف بہانوں اور طریقوں سے یتیم کا مال ہڑپ کر رہا ہے۔ ایک دوسرے کے مال کو ساتھ ملا کر بظاہر تجارت میں یتیم کا مال شامل کر لیا گیا ہے' لیکن مختلف حیلوں بہانوں سے کوشش ہو رہی ہے کہ کسی طرح اس کے مال کو ہڑپ کر لیا جائے۔ تو یہاں اس پس منظر میں ایک بڑی ہی اہم ہدایت دی جا رہی ہے کہ مالِ یتیم کو اپنے لئے مطلق حرام جانو' یوں سمجھو کہ یہ آگ ہے۔ جیسا کہ ایک جگہ قرآن مجید میں آیا بھی ہے کہ جو لوگ یتیموں کا مال ہڑپ کرتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں۔ (النساء : ۱۰) انہیں جاننا چاہئے کہ اِس وقت تو یہ مال بڑا محبوب اور مرغوب نظر آ رہا ہے لیکن آخرت میں یہ آگ کے انگارے بنیں گے۔ تو یہاں فرمایا کہ یتیم کے مال کے قریب نہ پھٹکو مگر بہت ہی اعلیٰ طریقے پر' احتیاط کے ساتھ' اس کی خیر خواہی کرتے ہوئے' اس کے مال کا اپنے آپ کو محافظ جانتے ہوئے۔ ﴿ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ﴾ "یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے"۔ اسے اپنے نفع اور نقصان کی خود سمجھ حاصل ہو جائے' اپنے پاؤں

© rasailojaraid.com

پر کھڑے ہونے کی استعداد پیدا ہو جائے۔ تو اس صورت میں ظاہر بات ہے کہ وہ تمام مال اس کے حوالے کر دیا جائے گا۔

یہ مالِ یتیم کے سلسلے میں ابتدائی ہدایتیں ہیں۔ اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قرآن کو سننے اور اسے پڑھنے کا انداز یہ تھا کہ جو احکام اس میں وارد ہوتے تھے وہ ان پر آخری امکانی حد تک عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ بہت سے ایسے صحابہؓ، جن کے زیر تربیت، زیر کفالت یا زیر سرپرستی کچھ یتیم تھے اور ان کا بھی کچھ مال تھا، انہوں نے اس سلسلے میں انتہائی احتیاط شروع کر دی۔ مثلاً کوئی یتیم ہے اور اس کا باغ ہے، کوئی یتیم ہے اور اس کا بھی کوئی بھیڑوں اور بکریوں کا گلہ ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ جو یتیم کا ولی اور سرپرست ہے وہی اس کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ تو یہاں تک کیا گیا کہ یتیم کی ہنڈیا اس کے مال میں سے علیحدہ پکے گی، تاکہ اس کا مال اور ہمارا مال کہیں مشترک ہانڈی میں جمع ہو کر گڈمڈ نہ ہو جائے اور مبادا اِس کے مال میں سے کوئی بوٹی یا اس کے شوربے میں سے کوئی ایک دو چمچے ہمارے پیٹ میں چلے جائیں۔ اس معاملے میں جب انتہائی شدت اختیار کی گئی تب سورۃ البقرہ میں حکم نازل ہوا کہ اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا، اللہ صرف یہ چاہتا ہے کہ احتیاط رکھو، محتاط ہو جاؤ، یتیم کا مال ہڑپ نہ کرو، اپنے آپ کو اس کا امین سمجھو۔ یہاں تک کہ پھر سورۃ النساء میں تفصیلی احکام آئے کہ جب وہ جوان ہو جائے تو اس کا مال اس کے حوالے کرو اور اس پر گواہ بناؤ کہ کیا مال تھا اور کس کس طریقے سے اس کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ یہ بڑے تفصیلی احکام ہیں۔ یہاں پر اس کو بھی اسلام کے نظامِ معاشرت میں بڑی اہمیت کے ساتھ بیان کر دیا گیا۔

ایفائے عہد کی تاکید

اس کے بعد فرمایا: ﴿ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ﴾ "اور وعدے کو پورا کرو۔" جب عہد کر لیا ہے تو اسے نبھاؤ، وعدہ ہوا ہے تو پورا کرو۔ اور یہاں اس ضمن میں تاکید کے لئے فرمایا گیا: ﴿ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ۝ ﴾ "عہد کے بارے میں (خدا کے ہاں) باز پرس ہو گی" یہ نہ سمجھو کہ یہ تو ہمارے آپس کے معاملات تھے، اللہ کو اس سے کیا تعلق۔ اللہ تو حساب لے

© rasailojaraid.com

اپنے روزوں کا اور اپنی نمازوں کا' اپنے احکام کا جو اس نے ہمیں دیئے ہیں۔ اگر ہمارا کوئی معاملہ ہوا ہے اور اس میں اگر ہمارے باہمی معاملات میں اونچ نیچ ہو گئی ہے تو اس کا کوئی تعلق اللہ کے ساتھ نہیں ہے۔ یہ غلط فہمی ہے' بلکہ ﴿ اِنَّ الْعَھْدَ کَانَ مَسْئُوْلاً ﴾ عہد کے بارے میں لوگوں کو جواب دہی کرنی ہوگی کہ کیا وعدہ کیا تھا اور اس کا ایفاء کیا یا نہیں کیا؟ اس کو پورا کیا یا نہیں کیا؟ یہ مضمون ہمارے اس منتخب نصاب میں بتکرار و اعادہ آیا ہے۔ آیۂ بِرّ' جو اس منتخب نصاب کے حصہ اول "جامع اسباق" میں سے دوسرا ہی سبق تھا' میں بھی فرمایا گیا تھا کہ ﴿ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عَاھَدُوْا ﴾ "اور اپنے عہد کے پورا کرنے والے جبکہ باہم کوئی معاہدہ کر لیں"۔ پھر سورۃ المؤمنون اور سورۃ المعارج کی آیات میں فرمایا : ﴿ وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِاَمٰنٰتِھِمْ وَعَھْدِھِمْ رٰعُوْنَ○ ﴾ "وہ لوگ کہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی رعایت کرنے والے ہیں" یعنی حفاظت کرنے والے ہیں۔

© rasailojaraid.com

عہد کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے تو یہ فتویٰ صادر فرمایا ہے : ((لَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَھْدَ لَہٗ)) کہ جس میں عہد کا پاس نہیں' ایفائے عہد کا مادہ نہیں' اس کا کوئی دین نہیں۔ اس لئے کہ تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دین بھی ایک معاہدہ ہے' بندے اور رب کے درمیان۔ ﴿ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ﴾ کے متعلق سورۃ الفاتحہ کے ضمن میں عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ ایک بہت بڑا قول و قرار ہے' ایک بہت بڑا معاہدہ ہے' جو پوری زندگی پر پھیلا ہوا ہے۔ اس معاہدے کو کیسے نبھاؤ گے اگر چھوٹے چھوٹے وعدے پورے نہیں کر سکتے؟ اگر ایک پیسے میں خیانت کا ارتکاب کر رہے ہو تو ایک کروڑ میں تمہاری امانت پر کیسے اعتماد کیا جائے گا؟ نبی اکرم ﷺ آغازِ وحی سے پہلے کاروبار کرتے تھے لیکن اس تجارت کے میدان میں حضورؐ نے اپنی شخصیت اور سیرت و کردار کا لوہا منوایا۔ آپؐ کہیں معاشرے سے کٹے ہوئے کسی راہب کی خانقاہ اور درگاہ میں زیر تربیت نہیں رہے بلکہ آپ نے زندگی کی منجدھار میں' معاشرے اور سماج کے عین بیچوں بیچ اپنی زندگی بھرپور طریقے سے بسر کی ہے۔ آپ نے نوجوانی کے عالم میں بھیڑیں اور بکریاں بھی چرائیں۔ اسی پر علامہ اقبال نے کہا ہے ؎ "شبانی سے کلیمی دو قدم ہے!" یہ وہ کام ہے جو تمام انبیاء کرام نے کیا' محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے بھی کیا' اس لئے کہ فطرت سے قریب تر ہونے میں

© rasailojaraid.com

اس کو بڑا دخل ہے۔ اس کے بعد آپ ؐ نے عمدہ ترین سطح پر تجارت کی۔ ایک واقعہ آتا ہے کہ ایک شخص سے کوئی کاروباری گفتگو ہو رہی تھی' ابھی معاہدہ اپنی تکمیلی شکل کو نہیں پہنچا تھا کہ اچانک اسے کوئی کام یاد آ گیا۔ اس نے کہا کہ آپ ؐ یہاں میرا انتظار کیجئے' میں ابھی آیا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ہاں تم ہو آؤ میں تمہارا انتظار یہیں کروں گا۔ وہ شخص چلا گیا اور بعد میں بھول گیا۔ حدیث میں الفاظ آتے ہیں "بَعْدَ ثَلاَثٍ" کہ تین کے بعد اسے یاد آیا۔ اب اندازہ یہی ہے جو اکثر شارحین حدیث نے کہا کہ "بَعْدَ ثَلاَثَةِ اَيَّامٍ" یعنی تین دن کے بعد یاد آیا۔ اس کے بعد وہ دوڑتا ہوا' ہانپتا ہوا آیا تو اس نے دیکھا کہ نبی اکرم ﷺ وہیں موجود ہیں۔ آپ ؐ نے فرمایا : تو نے مجھے مشقت میں ڈال دیا۔ جب اس نے معذرت کی تو حضور ؐ نے فرمایا بہر حال میں اپنے عہد کا پابند تھا' میں تمہیں زبان دے چکا تھا کہ میں یہاں انتظار کروں گا' لہٰذا میں یہاں موجود رہا۔

اسی کو حضور ؐ نے فرمایا : ((عِدَةُ الْمُؤْمِنِ كَاَخْذِ الْكَفِّ)) یعنی مؤمن کا وعدہ تو ایسے ہے جیسے ہاتھ پکڑ لیا گیا ہو۔ اب وہ اس طرح اپنے آپ کو بندھا ہوا محسوس کرتا ہے جیسے کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ہو' اسے جکڑ لیا ہو۔ یہ ہے وہ نفسیاتی احساس اور کیفیت جس کی شدت کو انسان اپنے باطن میں محسوس کرے کہ میں زبان دے چکا ہوں' بات ہو چکی ہے' قول و قرار ہو گیا ہے۔ غور کیجئے کہ کسی معاشرے میں اور خاص طور پر کاروبار' لین دین' بیع و شراء اور تجارت میں' اور اس کی پھر جتنی بھی زیادہ ترقی یافتہ اور پیچیدہ صورتیں ہیں' ان سب میں اصل چیز یہی ایفائے عہد ہے۔ بلکہ اس سے معاشرے کے نہ معلوم کتنے پہلوؤں میں اصلاح احوال اور streamlining کی کیفیت ہو جائے گی' بالکل overhauling کا انداز ہو جائے گا۔ اگر کسی معاشرے میں ایفائے عہد کا رواج ہو جائے اور لوگ واقعتاً اپنے وعدوں کی پابندی کریں اور اس میں جانبین کو یہ اعتماد ہو کہ جو بات ہو رہی ہے وہ یونہی پوری ہو گی تو اندازہ کیجئے کہ اس معاشرے میں کتنا سکون و اطمینان ہو گا اور کتنا کچھ خرچ جو خواہ مخواہ احتیاطی تدابیر کرنے پر ہوتا ہے' وہ نہ ہو گا۔ مثلاً کہیں چار مزدور کام کر رہے ہیں تو ان پر ایک سپروائزر کھڑا کیا جاتا ہے اور ان سپروائزروں پر ایک مزید سپروائزر کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ سارے غیر ترقیاتی

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

اخراجات ختم ہو سکتے ہیں اگر یہ اطمینان ہو کہ مزدور اپنے اس عہد میں بندھا ہوا کام کرے گا کہ میں نے جو آٹھ گھنٹے کام کرنا طے کیا ہے یہ مجھ پر واجب اور لازم ہے اور اپنی پوری قوتوں کو اس پر انڈیل دینا میرا فرض ہے' اس لئے کہ اس کے بغیر جو اُجرت میں لوں گا وہ میرے لئے جائز اور حلال نہ ہو سکے گی۔ تو اندازہ کیجئے کہ واقعتاً سارے انسانی معاملات کے لئے ایفائے عہد ایک بڑی ہی بنیادی اہمیت کی حامل چیز ہے۔

ناپ تول کو پورا کرنے کی تاکید

ان اوامر ونواہی یعنی do's and dont's کے سلسلے میں اگلا حکم ہے :

﴿ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ط﴾ ”جب تم ناپو تو پیمانہ پورا کرو اور جب تولو تو سیدھی ڈنڈی کے ساتھ تولو“۔ ﴿ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلاً ﴾ ”یہ بہتر طریقہ ہے اور انجامِ کار کے اعتبار سے بھی عمدہ ہے“۔ یہ گویا کسی معاشرے میں لینے اور دینے کے باٹ برابر رکھنے کی تاکید ہے۔ اگرچہ اس کا اطلاق وسیع تر پیمانے پر بھی ہو سکتا ہے کہ انسان لینے اور دینے کے پیمانے برابر رکھے اور جن معیارات پر وہ دوسروں کو پرکھتا ہے انہی پر وہ اپنے آپ کو بھی پرکھے' جس ترازو سے وہ دوسروں کو تولتا ہے اسی سے اپنے آپ کو تولے' جس پیمانے سے اپنے آپ کو ناپ رہا ہے اسی سے دوسروں کو ناپے' لیکن یہاں تعیّن کے طور پر ہمارے انسانی معاشرے میں کاروباری لین دین اور exchange کا جو سلسلہ چلتا ہے اس کے ضمن میں یہ بنیادی ہدایت دی جا رہی ہے کہ جب ناپ کر دو تو پیمانہ پورا کرو اور تول کر دو تو سیدھی ڈنڈی کے ساتھ تولو۔

قرآن مجید کی بالکل ابتدائی سورتوں میں بھی اس سماجی برائی یعنی ذرا سی ڈنڈی مار لینے اور ناپ تول کے اندر کچھ کمی کر دینے پر بڑی خوبصورتی کے ساتھ گرفت کی گئی ہے۔ سورۃ المُطفّفین کا آغاز ہی ان آیات سے ہوتا ہے : ﴿ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ○ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ○ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْوَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ○ ﴾ ”ہلاکت و بربادی اور تباہی ہے ان مُطفّفین کے لئے کہ جب ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب ناپ کر یا تول کر دوسروں کو دیتے ہیں تو کمی کر دیتے ہیں“۔ عربی زبان میں ”طفّ“

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

کہتے ہیں کسی بہت حقیر سی شے کو۔ یہاں پر بڑا بلیغ پیرایۂ بیان ہے کہ ڈنڈی تھوڑی سی مار لو گے 'سیر میں آدھی چھٹانک 'چھٹانک 'تولہ 'دو تولہ کی کمی کر لو گے۔ یہ نہایت حقیر اور چھوٹی بات ہے جس کے لئے تم نے اپنی دیانت اور امانت کا سودا کیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ اس کا براہ راست تعلق ایمان بالآخرۃ سے ہے۔ گویا تِل کی اوٹ میں پہاڑ ہے۔ تجزیہ تو کرو 'یہ ہاتھ کی ذرا سی جنبش بتا رہی ہے 'تمہارا ڈنڈی مارنے کا یہ تھوڑا سا عمل اس بات کی پوری غمازی کر رہا ہے کہ تمہیں آخرت کا یقین نہیں 'جزاء و سزا کا یقین نہیں 'خدا کے حاضر و ناظر ہونے کا یقین نہیں 'خدا کے "بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٍ" ہونے کا یقین نہیں 'یا خدا کی ہستی کا ہی یقین نہیں۔ بہرحال ایمان کا معاملہ عمل کے ساتھ جس قدر گہرا ربط لئے ہوئے ہے اس کی طرف یہاں اشارہ کر دیا گیا: ﴿ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ "کیا انہیں یہ گمان نہیں ہے کہ انہیں اٹھایا جائے گا اس بڑے دن کہ جس دن لوگوں کو اپنے رب العالمین کے حضور کھڑے ہونا ہے۔"

© rasailojaraid.com

یہ ہے وہ بات جس کو یہاں دہرایا گیا کہ اپنے پیمانے پورے کیا کرو' تولتے ہوئے ڈنڈی سیدھی رکھا کرو۔ فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ خَيْرٌ ﴾ "یہ خیر ہے"۔ اس میں بھی ایک اعتماد کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ ایسا نہیں کہ ہر شخص دوسرے کو چور سمجھے اور اس طرح ڈرتے ہوئے اور چوکس و چوکنا رہ کر اس سے معاملہ کرے۔ اس سے معاشرے کے اندر ایک عجیب کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ ہر شخص دوسرے کو چور 'خائن اور بددیانت سمجھ رہا ہے۔ اسے یہ اندیشہ ہے کہ ابھی کہیں ڈنڈی مار لی جائے گی 'ابھی کہیں ناپ تول میں کمی کر دی جائے گی 'ابھی کہیں میری جیب کاٹ لی جائے گی 'مجھ پر کوئی ڈاکہ ڈال دیا جائے گا۔ چنانچہ ناپ تول پورا رکھنے سے ایک طرف تو معاشرے میں اعتماد اور حسن ظن کی فضا ہوتی ہے۔ اور فرمایا ﴿ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴾ "اور انجامِ کار کے اعتبار سے بھی یہ طرزِ عمل بہت خوب ہے"۔ تم سمجھتے ہو کہ ناپ تول میں کمی کر کے تم نے کچھ بچایا ہے اور چند سکوں کی صورت میں زیادہ نفع کمایا ہے' حالانکہ ایسا نہیں' بلکہ تم مجرم ضمیر لئے ہوئے گھر کو لوٹے ہو۔ حقیقت میں خیر یہ نہیں' بلکہ خیر تو یہ ہے کہ پورے مطمئن قلب کے ساتھ اپنے گھروں کو لوٹو۔ اللہ تعالیٰ رازق ہے' تمہارا رزق اس کے ذمے ہے' وہ رزق تمہیں بہرطور بہم

© rasailojaraid.com

پہنچائے گا۔

توہمات کی روک تھام

آگے ایک بڑی اہم بات آ رہی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ کسی مسلمان معاشرے میں یہ ہدایت بڑی اہمیت کی حامل ہے : ﴿ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ﴾ "اس چیز کے پیچھے نہ پڑو کہ جس کے لئے تمہارے پاس کوئی علمی بنیاد نہیں ہے"۔ حکم دیا جا رہا ہے اتباع علم کا' یعنی پیروی کرو علم کی' اب ظاہر بات ہے کہ علم یا تو بالحواس ہے۔ ہم نے آنکھوں اور کانوں سے جو کچھ دیکھا اور سنا اس کی بنیاد پر ہم نے کوئی رائے قائم کی' یہ علم ہے۔ علم کا دوسرا دائرہ علم بالعقل ہے۔ انسان سمع و بصر سے حاصل شدہ معلومات کا اپنے ذہن میں تجزیہ کرتا ہے' اس سے استنتاج کرتا ہے' نتائج اخذ کرتا ہے' ان کو جوڑ کر ان سے کچھ حاصل کرتا ہے' یہ انسان کے ذہن کے تفقہ اور تعقّل کا عمل ہے۔ یہ علم بالعقل ہے۔ مزید برآں اسلام ایک اور ذریعۂ علم' کو بھی تسلیم کرتا ہے اور اسے علم کے ان دونوں سرچشموں (علم بالحواس اور علم بالعقل) سے بالاتر' زیادہ قابل اعتماد' زیادہ یقینی اور زیادہ وثوق و اعتماد کے قابل قرار دیتا ہے' اور وہ ہے علم بالوحی۔ بہرحال ذرائع علم یہی تین ہیں اور انہی سے حاصل شدہ معلومات "علم" کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ ظن اور قیاس ہے' وہ اٹکل پچو ہے' وہ تخمینے ہیں' وہ occult sciences کا ایک دائرہ ہے۔ کہیں ہاتھ کی لکیریں لئے بیٹھے ہو' کہیں ستاروں کی چال کے زائچے بنا رہے ہو۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان کو ان تمام چیزوں سے' ان تمام توہمات سے' ان تمام تخمینات سے بالکل آزاد کر کے اس کے موقف کی بنیاد اور اس کے عمل کی اساس علم پر قائم کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ انسان کے تمدن اور اس کے علمی اور سائنٹیفک ارتقاء کے لئے ایک بڑی ہی اہم ہدایت تھی۔ اور یہ بات تسلیم کی گئی ہے' مستشرقین نے مانا ہے' مغربی مفکرین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حقیقتاً دنیا میں توہمات کو ختم کرنے والا اور انسان کے عمل کو علم کی بنیاد پر استوار کرنے والا قرآن مجید ہے۔ زلزلے کے بارے میں ایک قدیم تصور یہ

© rasailojaraid.co

تھا کہ کوئی گائے ہے کہ جس کے سینگوں پر یہ زمین رکھی ہوئی ہے' جب وہ وزن ایک سینگ سے دوسرے سینگ پر منتقل کرتی ہے تو زلزلہ آ جاتا ہے۔ اس کی کیا دلیل ہے؟ کیا سند ہے؟ کس بنیاد پر یہ بات کہی جا رہی ہے؟ جب اس کی سند نہیں تو رد کر دیا پھر سند لاؤ جیسا کہ امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا تھا : "اِیْتُوْنِیْ بِشَیْءٍ مِّنْ کِتَابِ اللّٰہِ وَ سُنَّۃِ رَسُوْلِہٖ حَتّٰی اَقُوْل" اگر کوئی چیز ماوراءِ عقل ہے یا ماوراءِ حس ہے تو اس کے لئے کوئی سند اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کے فرمودات سے لاؤ' ہم مان لیں گے۔ لیکن اگر نہ وہ سمع و بصر کی گرفت میں آنے والی شے ہو' نہ ہمارے حواس اس کو verify کر سکتے ہوں' نہ وہ ہماری عقل کی میزان میں کسی طور سے پوری اُترتی ہو اور نہ اس کے لئے کوئی اساس اور بنیاد وحی کے علم میں موجود ہو' چاہے وہ وحی متلو ہو یا وحی غیر متلو' یعنی چاہے وہ قرآن ہو یا فرمودۂ نبی ﷺ ہو' ان سب سے باہر کسی بات کو تسلیم کرنے کے لئے ہم تیار نہیں۔ یہ نقطۂ نظر اور انداز ہے جس سے سائنس کے سفر کا آغاز ہوا ہے۔ اور یہ مانا گیا ہے کہ منطق استقرائی (inductive logic) کے موجد مسلمان ہیں اور اس کی طرف متوجہ کرنے والا قرآن ہے ؎

کھول آنکھ' زمیں دیکھ' فلک دیکھ' فضا دیکھ!
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!!

قرآن اپنے قاری کو متوجہ کرتا ہے کہ یہ آیاتِ اِلٰہیہ ہیں' ان کو دیکھو اور ان کی مدد سے نتائج اخذ کرو' استقراء سے کام لو' جو سائنس کی بنیاد ہے۔

اسلام سے قبل علم کی بنیاد ارسطو کی استخراجی منطق (deductive logic) پر تھی' اسی پر سارا دارومدار تھا' اسی سے گتھیوں پر گتھیاں بن بھی رہی تھیں اور سلجھ بھی رہی تھیں' بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سلجھتی کم' اُلجھتی زیادہ تھیں۔ لیکن اسلام نے آکر انسان کو اس منطق کی تنگ نائے سے نکالا اور اسے استخراج (deduction) کی بجائے استقراء (induction) کی طرف متوجہ کیا۔ دیکھئے' کس قدر عمدہ پیرایۂ بیان ہے : ﴿اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْہُ مَسْئُوْلًا ○﴾ تمہیں یہ استعدادات اللہ نے کیوں عطا کی ہیں؟ سماعت دی ہے تاکہ سنو' بصارت دی ہے تاکہ دیکھو' اور تمہارے اندر تفکرو

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

تعقّل کی قوتیں رکھی ہیں تاکہ غور و فکر اور سوچ بچار کرو۔ تمہیں استنباط‘ استدلال اور استنتاج کی صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں۔ ان سب کے بارے میں تم سے باز پُرس ہو گی کہ انہیں معطل کر کے رکھ چھوڑا تھا اور توہمات پر اپنے موقف کی بنیاد رکھی تھی یا ان قوتوں اور استعدادات کو استعمال کیا تھا؟ یہ اللہ کی امانتیں ہیں‘ اللہ کی نعمتیں ہیں‘ ان کا استعمال کرو۔ ان کے بارے میں تم سے باز پرس ہو گی‘ محاسبہ ہو گا‘ پوچھ گچھ ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ساری نجومیوں کے انداز میں پیشین گوئیاں‘ یہ دست شناسی اور اسی نوع کے سارے معاملات‘ منجموں کے حساب کتاب اور زائچوں کی تیاری‘ ان کی اسلامی تمدن اور اسلامی تہذیب میں کوئی جگہ نہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے یہاں تک ارشاد فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی منجم یا کسی پیشین گوئی کرنے والے کی پیشین گوئی کی تصدیق کرتا ہے تو اس نے اس کی تکذیب کی جو میں لایا ہوں۔ یعنی میری لائی ہوئی تعلیم کچھ اور ہے‘ اس کی بنیاد علم پر ہے‘ وہ علم بالحواس بھی ہے‘ علم بالعقل بھی ہے اور علم بالوحی بھی ہے‘ چنانچہ ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔــوْلًا﴾ اور اس چیز کے پیچھے نہ پڑو جس کے لئے تمہارے پاس کوئی علم نہیں‘ جسے تم verify نہیں کر سکتے۔ ہاں ایسی چیزوں کا ایک دائرہ عالم غیب کے امور پر مشتمل ہے‘ جو تمہارے حواس اور تمہاری عقل سے ماوراء ہیں‘ ان کی verification کے تم پابند نہیں ہو۔ لیکن ان کے ضمن میں جو قابل اعتماد ذریعہ ہے وہ وحی ہے۔ اس سے باہر جس چیز کے لئے کوئی علمی بنیاد نہ ہو اس پر اپنا موقف قائم نہ کرو!

تمکنت اور تکبّر کی ممانعت

اس سلسلے میں آخری بات یہ فرمائی گئی : ﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا﴾ ”اور زمین میں اکڑ کر مت چلو۔“ سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے آخر میں بھی آیا تھا : ﴿وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا﴾ دراصل رزائل نفس میں سے سب سے آخر میں انسان کا پیچھا چھوڑنے والی چیز تکبر ہے اور آخری چیز جو انسان کو محاسن اخلاق میں سے میسر آتی ہے وہ تواضع ہے‘ جو انسانی شخصیت کی پختگی کی سب سے

© rasailojaraid.com

نمایاں علامت ہے۔ لہٰذا سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے آخر میں بھی اس کا ذکر تھا اور یہاں بھی۔ اتنی کچھ اخلاقی' معاشرتی اور معاشی معاملات میں ہدایات دینے کے بعد اب فرمایا: ﴿ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ﴾ "اور زمین میں اکڑ کر نہ چلو۔" سورۂ لقمان میں تو اس کے لئے الفاظ آئے تھے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝ ﴾ کیسا دل میں اُتر جانے والا انداز ہے کہ تمہارے رب کو یہ پسند نہیں' وہ اکڑنے والوں' شیخی خوروں' چال میں تمکنت پیدا کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا' انہیں پسند نہیں کرتا۔ یہاں ایک دوسرے رُخ سے بات کی گئی ہے کہ چاہے کتنا اکڑ لو' کتنا پاؤں مار کر چلو' کتنے ہی دندناتے ہوئے چلنے کی کوشش کرو' تم ہماری زمین کو پھاڑ نہیں سکتے۔ ہماری مخلوقات بڑی عظیم ہیں' ہماری یہ کائنات اور اس کی وسعتیں تمہارے تصور اور تخیل سے بھی ماوراء ہیں۔ تم کتنی گردنیں اکڑا لو' کتنے ہی اونچے طرے لگا لو' بہرحال تم پہاڑوں کی بلندی کو نہیں پہنچ سکتے: ﴿ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۝ ﴾ "تم نہ زمین کو پھاڑ سکو گے' نہ بلندی میں پہاڑوں کو پہنچ پاؤ گے"۔

بندۂ مومن کے لئے آخری دلیل

پھر فرمایا: ﴿ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ۝ ﴾ وہی ترغیب (persuation) کا انداز ہے۔ اگر کوئی شخص خدا کو مانتا ہو تو اس کی ترغیب کے لئے آخری بات یہی ہوگی کہ یہ چیز خدا کو پسند نہیں ہے۔ اگر اپنے رب پر یقین اور ایمان ہے' اگر اس سے محبت ہے اور اگر اس کی رضا جوئی تمہاری زندگی کا نصب العین بن چکی ہے تو جان لو کہ یہ چیزیں تمہارے رب کو ناپسند ہیں۔ چونکہ یہاں اوامر بھی زیر بحث آئے اور نواہی بھی' حکم بھی دیئے گئے اور روکا بھی گیا' یہ کرو اور یہ نہ کرو۔ اللہ کے سوا کسی اور کی پرستش نہ کرو' والدین کے ساتھ حسن سلوک سے کام لو' قرابت داروں کو ان کا حق ادا کرو اور اگر کہیں مجبوراً ان سے اعراض کرنا ہی پڑ جائے تو ان سے نرمی کی بات کرو' اپنے ہاتھ کو نہ گردن سے باندھ لو نہ بالکل کھلا چھوڑ دو' میانہ روی اختیار کرو' ناحق قتل نہ کرو' زنا کے قریب نہ پھٹکو۔ تو یہاں اوامر بھی آئے اور نواہی بھی آئے۔ do's بھی ہیں

© rasailojaraid.com

dont's بھی ہیں کہ یہ کرو یہ نہ کرو۔ اس لئے فرمایا : ﴿ کُلُّ ذٰلِکَ کَانَ سَیِّئُہٗ عِنْدَ رَبِّکَ مَکْرُوْھًا ﴾ کہ یہ جو کچھ بیان ہوا ہے اس میں جو مکروہات ہیں وہ تیرے رب کو بہت ہی ناپسند ہیں' تیرا رب ان کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ بندۂ مومن کے لئے یہ آخری دلیل ہے۔ اب اس کے بعد اس سے قوی تر کوئی اور دلیل ممکن نہیں۔

حکمت و دانائی کی حقیقت

آگے فرمایا : ﴿ ذٰلِکَ مِمَّآ اَوْحٰٓی اِلَیْکَ رَبُّکَ مِنَ الْحِکْمَۃِ ط ﴾ بڑے پیارے الفاظ ہیں کہ اے محمد ﷺ ! یہ حکمت ہے' یہ دانائی ہے' یہ wisdom ہے جو آپؐ کے رب نے آپؐ پر وحی کی ہے۔ لفظ حکمت کو سمجھنے کے ضمن میں یہ مقام بڑا اہم ہے۔ بعض حضرات نے قرآن مجید کی اُن آیات کی' جن میں نبی اکرم ﷺ کے فرائض چہار گانہ کا بایں الفاظ ذکر ہے : ﴿ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ ﴾ ' تفسیر اس طور سے کی ہے کہ کتاب سے مُراد قرآن اور حکمت سے مُراد سُنّتِ رسولؐ یا احادیثِ رسولؐ لی ہیں۔ اس خیال کی قرآن مجید کے اس مقام کے حوالے سے تصحیح ضروری ہے۔ قرآن مجید میں احکام بھی ہیں اور قوانین کا بیان بھی ہے' شریعت اور فقہ بھی ہے' اور قرآن مجید ہی میں حکمت و دانائی (wisdom) بھی ہے۔ یہ خود قرآن مجید ہی کے دو رُخ (aspects) ہیں' ایک طرف قانون ہے اور ایک طرف اس قانون کی پشت پر کار فرما دانائی ہے۔ ایک طرف حکم ہے تو دوسری طرف اس حکم کی بنیاد جس حکمت پر قائم ہے' اس کا بیان ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کا اس درس کے دوران بار بار حوالہ آیا ہے۔ یہ مشابہت اس لفظ حکمت میں بھی موجود ہے۔ وہاں آغاز ہوا تھا : ﴿ وَلَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِکْمَۃَ اَنِ اشْکُرْ لِلّٰہِ ط وَمَنْ یَّشْکُرْ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِہٖ ط ﴾ وہاں نقطہ آغاز حکمت تھا' جبکہ یہاں اس پوری بحث کا اختتام حکمت کے ذکر پر ہو رہا ہے :

﴿ ذٰلِکَ مِمَّآ اَوْحٰٓی اِلَیْکَ رَبُّکَ مِنَ الْحِکْمَۃِ ط ﴾ یہ ہیں وہ باتیں' وہ ہدایات' وہ اوامر و نواہی اور ان کی تعلیم جو کہ تیرے رب نے وحی کی ہیں اے محمد ﷺ آپ پر از قسم حکمت۔

© rasailojaraid
© rasailojara

حرفِ آخر : توحید فی الالوہیت

اس سب کا لُبِّ لباب اور حاصل کیا ہے؟ —— یہ آخری بات "last but not the least" کے درجے میں فرمادی گئی : ﴿ وَلَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ﴾ اللہ کے ساتھ کسی اور کو الٰہ نہ بنالینا۔ یہ وہی بات ہے جو ہمارے کلمۂ طیّبہ کا جزوِ اوّل ہے : "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" ۔ پس اللہ کے سوا کسی کو معبود نہ ٹھہرالینا' اللہ کے سوا کسی اور کو الوہیت کا حامل نہ مان بیٹھنا۔ اللہ ہی الٰہ واحد ہے' وہی مطاعِ مطلق ہے' وہی محبوبِ حقیقی ہے۔

اِلٰہ کے لفظ کی تفصیل ہمارے اس منتخب نصاب میں پہلے کہیں نہیں آئی۔ یہ عجیب لفظ ہے۔ اس کے حروفِ اصلی میں' جو اس کا مادہ ہیں' اور پھر اس کے بنیادی لغوی مفاہیم کے اندر جامعیت کا عجیب رنگ ہے۔ "اِلٰہ" کا مادہ عربی زبان میں کئی معنوں میں آتا ہے۔ مثلاً "اَلَهَ الفصیلُ الٰی اُمِّہٖ" ۔ اونٹنی کا وہ بچہ جو ماں سے دُور کہیں باندھ دیا گیا تھا جب اسے موقع ملتا ہے تو وہ اپنی ماں کی طرف لپکتا ہے۔ اس مفہوم سے یہ لفظ الٰہ اخذ کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس مادے کا ایک مفہوم تحیر ہے۔ یعنی جس کی اصل حقیقت اور کنہ تک کوئی نہ پہنچ پائے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ "ولہ" سے ہے جس کا مفہوم والہانہ محبت ہے۔ گویا الٰہ وہ ہستی ہے جس کی طرف کوئی لپکتا ہے اپنی حاجت روائی کے لئے' اپنی مشکل کشائی کے لئے' اپنے مصائب کو دور کرنے کی درخواست لے کر' اپنی ضروریات کی بہم رسانی کی توقع کے ساتھ —— اور تمہارا مشکل کشا' تمہارا حاجت روا' تمہارا روزی رساں اور تمہاری تکالیف کا دُور فرمانے والا سوائے اللہ کے کوئی نہیں۔ یہ ہے بنیادی تصور الٰہ۔ اس کے بعد یہی لفظ آئے گا اُس ذات کے لئے جو محبت کے قابل ہو' جس سے والہانہ عشق ہو۔ اور وہ ذات بھی اللہ ہی کی ذات ہے۔ وہی محبوبِ حقیقی اور مطلوبِ اصلی ہے۔ اور پھر فلسفیانہ انداز میں بات کی جائے تو وہ ہستی کہ جس کی کنہ کو سمجھنا انسان کے لئے ناممکن ہو' جس کی ذات وراء الوراء' ثم وراء الوراء' ثم وراء الوراء ہو' جہاں انسان کے لئے سوائے تحیر کے اور کوئی چارہ باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ یوں سمجھئے کہ یہ جامع ہر اعتبار سے

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

راست آتا ہے صرف باری تعالیٰ کی ذات پر۔

مختلف مزاج، مختلف شعور کی سطحوں پر فائز، مختلف افتادِ طبع کے لوگ اپنی ذہنی سطح کے مطابق اللہ کا تصور رکھتے ہیں۔ عوام الناس کے نزدیک اللہ کا تصور یہی ہے کہ وہ روزی رساں ہے، تکالیف کا دُور کرنے والا ہے، دعائیں سننے والا ہے، تمنائیں برلانے والا ہے۔ ان کی ذہنی سطح پر معبود کا مفہوم یہی ہو گا "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" یعنی روزی رساں اس کے سوا کوئی نہیں، مشکل کشا اس کے سوا کوئی نہیں۔ حاجت روا اس کے سوا کوئی نہیں، تکلیفیں دور کرنے والا اس کے سوا کوئی نہیں اور اس کے سوا کوئی نہیں جو لوگوں کی دعائیں سنتا ہو، ان کو قبول کرتا ہو اور ان کی مصیبتوں کو دور فرماتا ہو۔ لیکن فلسفیانہ ذہن اور ہے۔ فلسفیانہ افتاد اور مزاج کا حامل شخص اللہ کو وہ ہستی مانتا ہے کہ ؏ "اے بروں از وہم و قیل و قال من"۔ جہاں انسان کا فکر تھک ہار کر رہ جائے، جس کی ہستی کا تصور ممکن نہ ہو، جس کی صفات کا تصور ممکن نہ ہو، وہ قادر ہے تو کتنا قادر ہے، وہ سمیع ہے تو کتنا سمیع ہے، وہ علیم ہے تو کتنا علیم ہے۔ وہ ذات کہ جہاں پر سوائے تحیر کے انسان کے پاس اور کوئی چارۂ کار نہیں وہ ہستی اللہ ہے۔ اور وہ شخص کہ جو عبادت کی اصل روح سے آشنا ہو چکا ہو، وہ شخص کہ جس کا دل بیدار ہو، اس کی روح زندہ ہو، اس کے لئے اللہ محبوبِ حقیقی ہے، مطلوبِ اصلی ہے۔ "لَا مَعْبُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ، لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ، لَا مَطْلُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ، لَا مَحْبُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ"۔

اگرچہ اس کلمہ طیبہ کے پہلے جزو کی اس سے بلند تر سطح بھی ہے، لیکن اس کا ذکر یہاں شاید اختصار کے ساتھ مناسب نہ رہے گا، تاہم صرف اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ اس پر اگرچہ کچھ بحث حقیقت شرک کے ضمن میں ہو چکی ہے کہ ایک مقام وہ بھی ہے جہاں اللہ کے سوا کسی الٰہ کی نفی کا معاملہ اس صورت میں سامنے آتا ہے کہ "لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ" یعنی وجودِ حقیقی صرف اللہ کا ہے۔ حقیقتاً موجود صرف وہ ہے، باقی جو کچھ ہے ؎

کلُّ ما فِی الکون وھمٌ او خیال
او عُکوسٌ فِی المَرایا او ظِلال

جو کچھ نظر آ رہا ہے یا وہ سائے ہیں یا عکس ہیں یا وہ ایک قوتِ واہمہ کی کارفرمائی ہے، جبکہ

© rasailojaraid.c

وجودِ حقیقی صرف اللہ کا ہے۔

انسان کا فکری ارتقاء ہو' انسان کی روحانی ترقی ہو' ان سب کی معراج یہ ہے کہ انسان اس "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کی حقیقت کو پالے۔ لہٰذا یہ ساری بحث و تمحیص اور یہ سارے اوامر و نواہی آخر میں آکر جس نقطے پر مرتکز ہوتے ہیں وہ نقطہ پھر وہی ہے جہاں سے آغاز ہوا تھا۔ آغاز شرک فی العبادت کی نفی سے ہوا تھا : ﴿ وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّآ اِيَّاهُ ﴾ اور اختتام ہوتا ہے شرک فی الالوہیت کی نفی سے : ﴿ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِىْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝ ﴾ یعنی شرک کا تو ایک ہی نتیجہ نکلے گا۔ اگر تم اس جرم کے مرتکب ہوئے تو پھر تمہاری حیثیت اُس خس و خاشاک اور اس کوڑے کرکٹ کی ہوگی جس کو دیا سلائی دکھادی جائے' جس کو آگ لگا دی جائے۔ چنانچہ تم مَلوم اور مدحور ہو کر یعنی ملامت زدہ (condemned) اور دھتکارے ہوئے جہنم میں جھونک دیئے جاؤ گے۔ اس لئے کہ تم شرفِ انسانیت سے تہی ہو گئے ہو۔ اگر تم نے شرک کا ارتکاب کیا تو تم اس منصب اور اس مقام و مرتبے سے اپنے آپ کو محروم کر چکے ہو۔ اگر تم نے توحید کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا تو اب تمہارا مصرف اور مقام اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ تمہیں جلایا جائے اور ابد الآباد تک نارِ جہنم میں جھونک دیا جائے۔

﴿ اَفَاَصْفٰكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ط ﴾ جیسا کہ عرض کیا جا چکا' شرک کی ایک شکل' جو اُس معاشرے میں موجود تھی' یہ تھی کہ بنی اسماعیل' مشرکینِ عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ تو مزاح کے انداز میں بھی تنقید کی گئی اور کچھ زجر' جھڑکی اور ڈانٹ کے انداز میں اظہارِ ناراضگی بھی فرمایا گیا کہ کیا تمہارے رب نے تمہیں تو چن لیا ہے بیٹوں کے لئے؟ اگر بیٹی ہو جائے تو تم شرمائے رہتے ہو' منہ چھپائے پھرتے ہو اور تم اس فکر میں ہوتے ہو کہ اسے کہیں گڑھے میں دفن کر آؤ اور جلد سے جلد اس عار اور بدنامی سے کسی نہ کسی طرح رستگاری اور چھٹکارا حاصل کر لو' اور خدا کے لئے تم نے بیٹیاں ٹھہرائی ہیں۔ تمہاری یہ تقسیم بڑی بھونڈی تقسیم ہے۔ جیسا کہ سورۃ النجم میں آیا ہے : ﴿ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ۝ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ۝ ﴾ "کیا تمہارے لئے بیٹے ہیں اور اس کے لئے بیٹیاں؟ یہ تقسیم تو

© rasailojaraid.com

بڑی ہی نامنصفانہ ہے"۔ یہ تو بڑی ہی عجیب تقسیم ہے جو تم نے کی ہے۔ لیکن اب مزاح کا معاملہ ختم ہوا' اور اس کے بعد فرمایا : ﴿ اِنَّکُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلاً عَظِیْمًا ○ ﴾ یہ بہت بڑی بات ہے جو تم کہہ رہے ہو۔ یہی انداز اگلی سورت یعنی سورۂ کہف میں نصاریٰ کے ذکر میں آتا ہے : ﴿ وَیُنْذِرَ الَّذِیْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ○ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ ط كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ط اِنْ یَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ○ ﴾ یعنی بہت بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکل رہی ہے۔ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ ان کے اس قول کے اندر کوئی صداقت نہیں ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ سرتاسر جھوٹ' تہمت اور بہتان ہے۔ اس پر یہ آیاتِ مبارکہ ختم ہو رہی ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ان اٹھارہ آیات میں ایک صالح تمدن' نیک اور صحت مند معاشرہ یا یوں کہہ لیجئے کہ اسلامی معاشرہ' اسلامی سوسائٹی اور اسلامی رہن سہن کا بڑا جامع نقشہ سامنے آ گیا ہے۔ تاہم اجتماعیت کی وہ سطح جبکہ ملی و ملکی اور سیاسی مسائل سامنے آئیں' ذرا بلند تر سطح ہے' ان سے بحث ان شاء اللہ اگلے درس میں ہو گی۔ اس سطح پر سورۃ الحجرات اجتماعیت کے ضمن میں قرآن مجید کی ہدایت کا ایک بڑا جامع مرقع ہے اور اسی پر ہمارا آئندہ درس مشتمل ہو گا۔ یہاں اس سے کم تر یعنی سماج' معاشرے' سوسائٹی کی سطح پر اسلام کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا' کن چیزوں کو پروان چڑھانا چاہتا ہے اور کن چیزوں کا استیصال اسے منظور ہے' اس کا ایک بڑا جامع نقشہ سامنے آ گیا ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ○○

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک نہایت مؤثر اور جامع خطاب

مثیلِ عیسیٰ ---- علیؓ مرتضیٰ رضؓ

شائع کردہ : مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' ۳۶۔کے' ماڈل ٹاؤن

© rasailojaraid.com